ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "شہر افسوس" میں ہجرت اور ناسٹلجیا کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of Migration and Nostalgia Issues in Intizar Hussain's Fictional Collection" Shehr e Afsos''

Kamran Joyia, MPhil (Urdu) Lahore Leads University Lahore abnerjoyia1@gmail.com
Dr. Ansar Abbas, Assistant Professor Department of Urdu University of Mianwali
Muhammad Umar, Mphil Urdu, SST Urdu Centre of Excellence Boys High School Nankana Sahib

Abstract

Intizar Hussain started writing fiction at that time when Krishan Chander, Saadat Hasan Manto, Rajinder Singh Bedi, Asmat Choghatai and other artists were present in this field.

The style of waiting is its own invention, which is a combination of tradition and innovation. In his stories, the natural elements are also seen in the role of the characters. They keep their imagination and thought from the earth in every moment. They make the memory get lost. If the past is lost, then the human being is complete and remains incomplete.

Intizar Hussain's technical point of view and division of the matter is the same. He helped to understand everything. He was also influenced by Meer Anees, Nazeer Akbar Abadi and Muhammed Hussain Azad. There was a great tragedy in the history of Muslims. Nazeer saw the earth as the source of human progress and the sense of individuality. It was about history and civilization. It was empty, but waiting for Intizar Hussain's artistic journey, the influence of all three personalities. His collections of short stories are "Galli Koochay", "Kankri", "Din aor Dastaan", "Aakhri Aadmi", "Shehr e Afsos", "Kichway", "Khemay say Door" ، and ''Shehr Zaad''.

Key Words:

Intizar Hussain, Krishan Chander, Saadat Hasan Manto, Rajinder Singh Bedi, Asmat Choghatai, Meer Anees, Nazeer Akbar Abadi, Muhammed Hussain Azad, "Galli Koochay", "Kankri", "Din aor Dastaan", "Aakhri Aadmi", "Shehr e Afsos", "Kichway", "Khemay say Door", ''Shehr Zaad''.

انتظار حسین اردو کے نمایاں فد کشن نگار ہیں۔ اُن کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''شہر افسوس'' ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء میں مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے افسانوی کلیات کو دو جلدوں میں شائع کرایا۔ پہلی جلد "جنم کہانیاں" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ جس میں ابتدائی چار افسانوی مجموعے ''گلی کوچے''، "کنکری"، "دن اور داستان"، "آخری آدمی" اور کلیات کی دوسری جلد "قصہ کہانیاں" کے نام سے ۱۹۹۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں تین افسانوی مجموعے ''شہر افسوس، "کچھوے"، "خیمے سے دور'' شامل تھے۔ اس کے بعد "خالی پنجرہ" کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ اور سامنے آیا۔ یہ بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں کل سولہ افسانے شامل تھے اس کے بعد ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''شہر زاد" کے نام سے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا اس میں پندرہ افسانے شامل تھے۔ اور اب ان کے تمام افسانوی مجموعوں کو ایک مکمل کلیات کی شکل میں بعنوان ''مجموعہ انتظار حسین" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ جس میں ان کے آٹھوں افسانوی مجموعے شامل ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس میدان میں اپنی شناخت بنائی۔

ان کا ''وہ جو کھوئے گئے'' ہجرت کے حوالے سے شاہکار افسانہ ہے جس میں انہوں نے سانحہ مشرقی پاکستان ہجرت غرناطہ، شاہجہاں آباد اور بیت المقدس کے تناظر میں ہجرت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے چار کرداروں کے ذریعے ہجرت کی صورت حال اور اس کے بعد مہاجرین کے لئے ان کی اپنی شناخت اور ان کے Identityfication کے مسئلے کو بڑی خوبی سے اٹھایا ہے کہ کس طرح سے ہجرت کے بعد مہاجرین اپنی تہذیبی اقدار و روایات اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں۔ کیونکہ جب تک کردار اپنے وطن (ہندوستان) میں تھے تو یہاں ہندو اسلامک کلچر تھا اور وہاں پاکستان کا کلچر یکسر مختلف تھا۔ اس افسانے کے چاروں کردار باریش آدمی، زخمی سر والا، تھیلے والا، اور نوجوان آدمی یہ چاروں کہیں سے ہجرت کر کے آئے ہیں اور چاروں اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔

''چلو خدا کا شکر ہے کہ ہم سلامت نکل آئے ہیں۔ اس آدمی نے جس کے گلے میں تھیلا پڑا تھا، تائید میں سر ہلایا: بے شک کم از کم ہم اپنی جانیں بچا کر لے آئے ہیں نا۔''(۱)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

یہ چاروں مہاجر ہیں جو کہیں سے بھاگ کر آئے ہیں مگر یہاں آنے کے بعد ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور یہ چاروں ایک ایک کو گننا شروع کر دیتے ہیں مگر ہر بار ان میں سے ایک آدمی کم ہو جاتا ہے۔ یہ چاروں باری باری سے اپنے چاروں ساتھیوں کو شمار کرتے ہیں مگر ہمیشہ ایک آدمی کم رہ جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد وہ اس کتے کے واہمے کا شکار ہو جاتے ہیں جو کتا ان سے دور کسی گلی میں بھونک رہا ہے ان چاروں کو لگتا ہے کہ اس کتے نے ان کے ایک ساتھی کا رستہ روک رکھا ہے، جبکہ یہ کتا ایک واہمہ ہے۔ اس کتے کے حوالے سے انتظار حسین نے مہاجرین کا اپنے غیر ملک میں اجنبیت اور معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ وہاں ان کے تہذیب و تمدن روایت و اقدار کو کوئی پہچاننے والا نہیں ہے وہ اپنے غیر کے وطن میں اجنبی ہو گئے ہیں۔ پہلے زخمی سر والا اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کو لینے جاتا ہے مگر وہ اکیلا واپس آتا ہے اس کے تھیلے والا جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ باریش آدمی بھی اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے کہ کیوں نہ سب مل کر چلیں اور اس کے دونوں باقی ساتھی بھی چل دیتے ہیں۔ جس طرف سے کتے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر دور تک جانے کے بعد نظر نہیں آتا۔ وہ سب پکار کر بھی دیکھتے ہیں۔ اتنے میں اچانک زخمی سر والا ٹھٹکتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ اس کے بعد باریش آدمی اور نوجوان اپنے ذہنوں پر زور دیتے ہیں مگر اس کا نام ان کو یاد نہیں آتا۔ یہاں انتظار حسین نے انسان کے وجود و تشخص جیسے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مہاجرین اپنی سرزمین چھوڑنے کے بعد کس طرح اپنے وجود اور شناخت سے عاری ہو جاتے ہیں۔

> ”اس سے باریش آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن پر زور ڈال کر سوچتا رہا پھر متفکر لہجے میں بولا عزیزو! پلٹ چلو کہ اب ڈھونڈے میں جو کھوں ہے۔ یوں کہ اب نہ ہمیں اس کا نام یاد ہے نہ صورت یاد ہے۔ ایسی صورت میں کیا خبر کون مل جائے۔ ہم سمجھیں کہ وہ ہے اور وہ نہ ہو کوئی اور ہو۔ یہ غیر وقت ہے اور راستے میں ہیں دوست۔“(۲)

اس طرح انتظار حسین نے ایک واہمہ کے ذریعہ ہجرت کے مسائل کو بڑے پر زور انداز میں اٹھایا ہے کہ مہاجرین نے پاکستان جا کر اپنی شناخت کھو دی ہے۔ ان کے وجود خطرے میں پڑ گئے ہیں اس کے بعد یہ چاروں کردار پلٹ کر جب اپنے جگہ پر واپس آتے ہیں، جہاں سے اپنے ساتھی کو ڈھونڈنے چلے تھے تو پھر نوجوان ساتھی سوال کرتا ہے کہ وہ آدمی کون تھا جو ہمارے ساتھ چلا تھا تو سب جواب دیتے ہیں کہ ہم اس کو بھول چکے ہیں۔

> ”یہ عجیب بات ہے۔ تھیلے والا کہنے لگا۔ نہ ہمیں اس کا نام یاد رہا نہ صورت یاد رہی۔ تو وہ ہم میں سے نہیں تھا کیا؟“(۳)

بس اس نوجوان کی بات سن کر سب سناٹے میں آجاتے ہیں اور اس کے بعد باریش آدمی کہتا ہے کہ ہمارے لئے یہی عافیت ہے کہ جس وقت ہم گھروں سے نکلے تھے اس میں کون کس کو پہچان سکتا تھا اور کون کس کو شمار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد نوجوان پھر سوال کرتا ہے کہ ہم کب چلے تھے اور ہم کتنے تھے اور کہاں سے چلے تھے تو باریش آدمی جواب دیتا ہے کہ ہمیں بس اتنا پتہ ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں اس کی بات سن کر سب ہنستے ہیں۔

> ”تو تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسا“ میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے"، کہتے کہتے وہ رک گیا۔“(۴)

یوں انتظار حسین کے یہاں چونکہ ہجرت ایک رجحان اور فلسفہ ہے کہ انسان ابتدا سے اب تک ہجرت ہی کر رہا ہے۔ آدم کا جنت سے ہجرت مسلم امہ کا غرناطہ سے ہجرت، حبشہ سے ہجرت، فلسطین، اسپین سے ہجرت یعنی انسان کے یہاں ہجرت ایک فلسفہ ہے۔ زخمی سر والے کے اس بات سے چاروں ساتھی بہت متاثر ہوتے ہیں اور پھر باریش آدمی آبدیدہ ہو کر کہتا ہے۔

> ”پھر ہم اپنا سب کچھ تو چھوڑ آ گئے تھے مگر کیا ہم اپنی یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں تو؟“(۵)

وہ تھیلے والا آدمی کہتا ہے کہ ہم اس قدر جلدی مین اپنے گھر سے نکلے تھے کہ ہمارے گھر دھڑا دھڑ جل رہے تھے یعنی چاروں کسی بڑے فساد کے شکار ہوئے ہیں۔ ان کے گھر جلا دیئے گئے ہیں اور ان کے سر زخمی ہیں ان کے سر سے خون بہہ رہا ہے بستیاں جل گئی ہیں پورا معاشرہ اور خلقت کسی بڑے فرقہ وارانہ فساد کی شکار ہو گئی ہے اور یہ چاروں بڑی ہیجانی کیفیت سے گذر رہے ہیں اور یہ اس مصیبت کے شکار ہونے کے بعد سے اپنی شناخت، ہوش و حواس، یادداشت، شکل و صورت ایک دوسرے کے بھول گئے ہیں یہ بہت ہی دہشت زدہ ہیں ان کے یہاں ویرانہ پین، دہشت، تنہائی، خوف، وسوسہ کا عجیب عالم ہے اور اس خوف و

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

دہشت کے حوالے سے انتظار حسین نے انحطاط، زوال، ہزیمت وشکست، خانہ بربادی کی علامتوں کو پیش کیا ہے۔ یہ چاروں اپنے شہر سے اس خوف وہراس کے عالم میں نکلے ہیں کہ ان پر پوری طرح سے دہشت حاوی ہوگئی ہے اور خوف، دہشت اس طرح سے ان کے ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے کہ ان کی شخصیات شک کی دائرے میں آگئی ہے وہ مشکوک ہوگئے ہیں۔ یہ چاروں بڑے شش وپنج میں مبتلا ہیں۔ ان کا آدمیت سے اعتبار اٹھ گیا ہے یہ چاروں اتنے صدمے سے گذر رہے ہیں کہ اپنی صورت حال بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

اس طرح ان کے دماغ اور ذہن دونوں زخم ماضی اور یاد ماضی سے سن ہوگئے ہیں وہ بار بار ایک دوسرے کو شمار کرتے ہیں اور چاروں اپنے ماضی کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کو کچھ یاد نہیں آتا ہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو شمار کرنا بھول جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے وجود پر شک کرنے لگتے ہیں کہ کیا وہ ہیں ان کا وجود ہے اور وہ اپنے وجود پر ایک دوسرے کو گواہ بناتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور ان کا وجود قائم ہے۔ اس پورے افسانے میں انتظار حسین نے بار بار یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد انسان اپنا وجود، اپنی شناخت، اپنی قدریں، اپنی روایتیں، سب کھو دیتا ہے یہ ہجرت چاہے جہاں آباد، دہلی، غرناطہ، اسپین، ہندوستان مشرقی پاکستان کہیں سے بھی ہو یہاں تک کہ اس کا وجود دوسروں کی گواہی کے پر محفوظ رہتا ہے اگر دوسرے لوگ اس شخصیت کو نکال دیں تو کہاں جائے گا۔ وہ اپنے زمان و مکان، زبان و بیان تہذیب واقدار، رسم ورواج تمام اشیاء سے عاری ہو چکا ہے اس گمشدگی کا ذمہ دار کون ہے اس کی ذمہ دار ہجرت، مسافرت، جلاوطنی کی زندگی ہے۔ کیونکہ ان اقدار کے بغیر ان کا وجود خالی ہو گیا ہے وہ اندر سے ٹوٹ چکے ہیں ان کی روحیں مردہ ہو چکی ہیں۔ وہ زندہ ہیں تو صرف لوگوں کی گواہی کے پر زندہ ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ روحانی طور پر مردہ ہو چکے ہیں اب ان کے لئے یہ مساجد کے اونچے اونچے مینار، یروشلم، مسجد اقصیٰ، جو مسلم امہ کے لئے روشن مینار تھے ان سے ان کا رشتہ کٹ گیا ہے۔

"وہ زخمی سر والا پھر بے مزہ ہو گیا میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ
وہ کون سی ساعت تھی اور کون سا موسم تھا اور کون سی بستی تھی؟۔"(۶)

یہ چاروں اتنے شدید صدمے میں گھر سے نکلے ہیں کہ وہ اپنا وجود اور اپنی شناخت کھو چکے ہیں اور ان کی پوری شخصیت شک، تذبذب، وسوسہ، وہم اور خوف کے دائرے میں آگئی ہے وہ دراصل اس تلاش وجستجو کے ذریعے سے اپنی گم شدہ ہے پہچان اور پیچھے رہ جانے والی تہذیبی وثقافتی شناخت کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب، اپنی جڑ سے کٹ چکے ہیں اور اس پوری کہانی میں وجود کی تلاش وتحیر وتعجب کی کیفیت تشخص ذات کی تلاش کہانی کے آخر تک قائم رہتی ہے اور زخمی سر لہولہان ہیں اس سے ان کے قتل وغارت گری کے میدان سے بھاگے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ خون کا رسنا زخمی سر یہ سب تباہی وبربادی کے علامت ہیں اور یہ زخم جدائی کا اور زمینوں، تہذیبوں اور جڑ سے کٹنے کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پوری کہانی حکائی اور داستانوی اسلوب میں بیان کی گئی ہے اور اس کے کینوس کو وسیع کرنے کے لئے انتظار حسین نے اس ہجرت کو برصغیر کی ہجرت سے جوڑ دیا ہے جو بنیادی طور پر تقسیم ہند تقسیم مشرقی پاکستان سے متعلق ہے جس نے ایک پوری تہذیب اور قوم کو اپنی زبان اپنے جڑ سے جدا کر دیا ہے اس المیاتی بیان کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ قاری کی روح اس المیے سے تڑپ اٹھتی ہے اور انسان جو اپنے مخصوص دھارے سے کٹ گیا ہے تو اس کا سینہ اپنی جڑ، شخصیت اصلیت کی تلاش میں دھڑکتا رہتا ہے۔ اور ہجرت کے علاقے اور عہد جو بھی ہوں، ہجرت کے اسباب وعلل جو بھی ہوں مہاجر سب کے سب یکساں ذہنی ونفسیاتی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس طرح کٹا ہوا ڈبا انتظار حسین کے یہاں ہجرت ایک فلسفہ، رجحان اور اسطورہ اور لیجینڈ ہے اور اس کے لئے سفر لازم ہے اس لئے ان کے یہاں سفر سے متعلق چند بہت مشہور کہانیاں ملتی ہیں مثلاً وہ جو کھوئے گئے، شہر افسوس، ہمسفر، پرچھائیں، "کٹا ہوا ڈبا" وغیرہ یہ کہانیاں ایک لیجینڈ کا درجہ رکھتی ہیں جس کے تحت انتظار حسین نے زمانی، روحانی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی جیسی ہجرت کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں میں انسان کے اندرونی ہجرت اور سفر کی مختلف جہتوں جیسے متنوع مسائل کو متنوع وسائل سے پیش کیا ہے "کٹا ہوا ڈبا انتظار حسین کا اجتماعی لاشعور اور انفرادی لاشعور یونگ کے اجتماعی لاشعور اور نسلی شعور جیسی اصطلاحات بخوبی مطابقت رکھتا ہے۔ اس کہانی میں چار افراد ہیں بندو میاں، مرزا صاحب، شجاعت علی، منظور حسین جو باری باری سے اپنے سفر کی داستان سناتے ہیں۔ بندو میاں سے کہانی شروع ہوتی ہے اور شجاعت علی کو کہانی پسند نہیں آتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تمہاری عمر اور تجربہ کیا ہے؟ تو نے ایک سفر کیا اور ذرا سے نقصان سے سفر کو گھاٹے کا سودا سمجھ لیا سفر ایک چیز ہے دیگر است پھر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ شجاعت تم ان ناتجربہ کار بچوں سے کیا بحث کرتے ہو سفر سے متعلق انہیں کیا پتہ کہ سفر کیا ہوتا ہے۔ ریل گاڑی نے سفر کو ختم کر دیا پلک جھپکنے میں، منزلیں آجاتی ہیں ورنہ پہلے تھا کہ منزل آتے آتے سلطنتیں بدل جاتی تھیں بیٹے باپ بن جاتے تھے اور بیٹیوں کے لئے بر کی تلاش شروع ہو جاتی تھی۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

یہ بندو میاں چونکہ دور حاضر کا نمائندہ ہے اس لیے کہتا ہے کہ مرزا صاحب آجکل تو سلطنتیں پلک جھپکنے میں بدل جاتی ہیں۔ اگلے اسٹیشن پر اخبار والا چلاتا ہے کہ حکومت کا تختہ پلٹ گیا۔ مرزا صاحب اور شجاعت علی اگلے زمانے کے لوگ ہیں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ حکومت بدل جاتی ہے مگر سکہ تو نہیں بدلتا، پہلے سکے بھی بدل جاتے تھے، پہلے کا سفر قیامت کا سفر ہوتا تھا، سینکڑوں میل کا سفر، درمیان میں کہیں جنگل، پہاڑ، شہر، چھوٹے چھوٹے، بٹ مار چڑیل، نہ گھڑی نہ بجلی ، صرف مشعل ہوتے تھے جو یکایک بجھ جاتے تھے تو دل ڈھڑکنے لگتا تھا اور اس کے بعد مرزا صاحب بہت معقول بات کہتے ہیں۔

> ”جب سواریاں ختم سفر ختم، ریل چل نکلی، سفر کو اب طبیعت ہی نہیں لیتی۔ ایک سفر باقی ہے، سو وہ بے سواری کا ہے۔ وقت آئے گا چل کھڑے ہونگے۔ مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہو گئے تھے۔“(۷)

انتظار حسین نے اس اقتباس میں ساری باتیں کہہ دی ہیں کہ مرزا صاحب جو اگلے زمانے کے ہیں ان کو نئے زمانے سے شکایت نہیں ہے اگر سفر کے وسائل میں آسانیاں پیدا ہو میں تو اچھی بات مگر ان نئے وسائل کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے اور اس کے صناعی ذہنیت کی رنگارنگی اور زرخیزی بھی ختم ہو گئی ہے۔ منظور حسین دور حاضر کا آدمی ہے جس کو اپنی ایک بھولی کہانی یاد آتی ہے اور وہ ہر بار سنانے کی کوشش تو کرتا ہے مگر کوئی دوسرا اپنا قصہ شروع کر دیتا ہے اور وہ اسی کشاکش میں رہتا ہے کہ اتنے دن کے بعد اس واقع کا ذکر اس کی زبان پر کیوں نہیں آیا اس کو لگتا ہے اب اس کہانی کو سنانے میں کوئی مزہ نہیں ہے وہ زمانہ گذر گیا نہ اس عمر کے لوگ ہیں اور نہ وہ دور ہے منظور حسین اسی ہیر پھیر میں رہتا ہے کہ بندو میاں بول پڑتا ہے۔

> ”جی میں صورت رکھنے کی بھی اچھی رہی۔ جو لوگ بستر بوریا باندھ کے گھر سے عشق کرنے کے لئے سفر پہ نکلتے ہیں، وہ بھی خوب لوگ ہوتے ہیں۔ کیا خوب! غم عشق بھی تلاش روزگار ہوا۔“(۸)

اس کے بعد مرزا صاحب، شجاعت علی، بندو میاں اپنی کہانیاں سناتے ہیں بڑی دیر کے بعد منظور حسین کو اپنی کہانیاں سنانے کا موقع ملتا ہے تو گلی سے ایک میت گزرتی ہے اور ساری بات فوری طور پر اس کے ذہن سے اتر جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اس کو بلانے آجاتا ہے وہ جاتے جاتے گھر کے دروازے پر پہونچ کر ٹھٹکتا ہے کہ کہانی ضرور سنانی ہے مگر مونڈھے خالی ہونے، کے بعد وہ کہانی نہیں سناتا ہے۔ اس کہانی میں ریل ایک نئی تہذیب و تمدن بن کر ابھرتی ہے جس کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس ریل کی گاڑی کی سیٹی دراصل عہد وسطی کے روایت کو الوادع کہنا ہے اور اس کے بعد نئے دور کی شروعات ہو چکی ہے نئے دور کی سواریاں یعنی، ریل، نئے دور، اور مشینی و صنعتی و صارفیتی عہد اور فرنگیوں کی غلامی کے دور شروع ہو گئے ہیں یعنی جب ہندوستان میں فرنگی آئے تو انہوں نے پیروں فقیروں اور رشیوں منیوں کی سادھی ڈھاکے کے ایک ریل کی پڑی بچھائی تھی تو ہندو مسلم دونوں قومیں احتجاج کرنے لگتی ہیں مگر غالب فرنگی ہی رہتے ہیں انہوں نے ہندوستان میں اپنی تہذیب و روایت کو ہندوستانی پر لادنے کی کوشش کی اور ریل کو ایک علامت کے طور پر استعمال کر کے انتظار حسین نے ایک نئے دور نئے عہد اور روایت و مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

> ”نئے دور کی سواری آئی، فرنگیوں کی غلامی کا دور آیا۔ مشینی صنعتی دور آیا اور اسی ریل کی بنجر سفر سے ہی منظور حسین کے سینے میں ایک روشنی کی کرن اترتی ہے اور وہ اس کا نقطہ روشن ہو جاتا ہے۔ اسی کرن سے اس کے زندگی کے تمام گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ منظور حسین کی کہانی ان کہی ہی رہ جاتی ہے۔ ان گنت اسٹیشن آئے اور گذر گئے، ان گنت بار ریل گاڑی کی رفتار دھیمی پڑی، دھیمی پڑتی گئی، اندھیرے ڈبے میں اجالا ہوا، پھیری والوں نے قلیوں اور نکلتے بڑھتے مسافروں کا شور بلند ہوا، سیٹی کے ساتھ جھٹکا لگا اور پھر ریل چل پڑی۔ چلتے چلتے پھر وہی کیفیت جیسے اس کا ڈبا گاڑی سے بچھڑ کر اکیلا کھڑا رہ گیا ہے اور گاڑی سیٹی دیتی شور مچاتی بہت دور نکل گئی ہے۔“(۹)

انتظار حسین نے مرزا صاحب کے حوالے سے قدیم ماضی کو پینٹ کیا ہے جو ہمارے نسلی شعور کا حصہ ہے اور زمانے جن کی تین قسمیں ہیں ماضی حال مستقبل اور ماضی نے اس کہانی میں تین روپ اختیار کیا ہے ایک انسانی نسل کا جو پوری نسل کا ورثہ ہے اور دوسرا جس کو شجاعت علی نے چھیڑا ہے جو پورے براعظم کے مسلمانوں کا المناک تجربہ ہے یہ دور مسلمانوں پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کے حوالے سے گذرا ہے اور ایک تیسرا دور وہ ہے یعنی ایک نئی اجنبی تہذیب کی سواری یعنی فرنگیوں کی تہذیب جو مشرقی تہذیب کو نیست و نابود کر رہی ہے۔ انتظار حسین نے سفر کے حوالے سے اطمینان کی زندگی اور بے اطمینانی کی کیفیت، اداسی،

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

تنہائی، شک وسوسے کو ابھارا ہے کہ دور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی یلغار سے روبزوال ہے اس میں انہوں نے ماضی حال، اور مستبقل کے تصور کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے جب ماضی حال میں جا کر ملتا ہے اور یہ دونوں وقت جس وقت ملتے ہیں تو وہ در حقیقت ماضی اور حال کا جنکشن ہوتا ہے اور سامنے سے گذرنے والی میت مستقبل کی علامت ہے یعنی انسان پیدائش سے لے کر سفر موت تک سفر کرتا رہتا ہے یعنی بیل گاڑی گھوڑ سواری اس کے ابتدائی دور ہیں ریل اس کا حال ہے اور اس کی آخری منزل میت ہے جو بہت مشکل سفر ہے اس کو کسی بھی تکنیک سے کراس نہیں کر سکتے ہیں یہ ایک اٹل اور آخری سفر ہے۔

"سب کھاؤں سے لمبی کتھا، سواریاں بدل گئیں سفر کی خطرناکی ختم ہوئی مگر ایک سفر اسی طرح اندھیرا اور گنگ ہے۔ لالٹین لے کر نکلیئے، مشالیں جلایئے، بجلی روشن کیجئے، یہ اندھیرا کل ہے۔ ماضی بھی اندھیرا، مستقبل بھی اندھیرا۔ منور نقطہ حال ہے۔"(۱۰)

انسان اس دنیا میں سفر کرتا ہے کبھی وہ ڈرتا ہے کبھی رکتا ہے اور پھر چلتا ہے اور سفر کرتے کرتے وہ اس منور کران کو حاصل کر لیتا ہے جس سے اس کو پیشگی کی زندگی مل جاتی ہے جو اس کے زندگی کی آخری کہانی ہوتی ہے انسان سفر کرنے سے کبھی باز نہیں آتا ہے کیونکہ سفر وسیلہ ظفر ہے یہ سفر علم، سفر ہجرت سفر دین، سفر مذہب، سفر سائنس ٹیکنالوجی کا سفر ہو وہ زندگی میں برابر سفر کرتا رہتا ہے سفر ان کے یہاں ایک لیجینڈ اور ان کے فن کا ایک خاص حصہ بھی ہے۔ دہلیز یاد ماضی ناسٹلجیا سے متاثر کہانی ہے جس میں پرانی یاد میں اور بچپن سے لیکر جوانی تک ماضی کے وہ لمحات جو ماضی میں کھو گئے ہیں اس کہانی کی مرکزی کردار ایک لڑکی ہے جو اپنی یادوں کو اس بند کوٹھری میں سمیٹے ہوئے ہے جو کوٹھری کی دہلیز ہے وہ اس کے ذہنی و روحانی درون خانے میں بسا ہوا ہے وہ اس اندھیرے دہلیز میں اپنے بچپن، جوانی اور کچھ بچپنے کے رومانس جیسے لمحات کو قید ہوئے ہیں۔ یہ عورت اس رہس مے اور اسرار و بھید سے بھرے دہلیز کی کہانی بیان کرتی ہے کہ وہ کس طرح اس کوٹھری میں کھیلتی اور چھپتی تھی اور اس کے بعد اس کی والدہ کے انتقال سے ہی اس دہلیز میں تالا پڑ جاتا ہے اس کا رہس مے سایہ اس کی زندگی سے ختم ہو جاتا ہے اس لئے کوٹھری کی دہلیز صرف موسم سرما گرما میں بستروں کو سکھانے کے لئے کھلتا تھا یا پھر کسی برتن کے نکالنے کے ہی اس کو کھولا جاتا تھا یہ گھر اتنا بیس مے ہے کہ بچوں کو کبھی جھاڑو، اور کبھی اس سے اندھیرے میں سانپ ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور کبھی کبھی ان بچوں کو لگتا ہے کہ کوئی جانور سرسراتا ہوا صندوقوں اور دیگچیوں میں جا کر چھپ جاتا ہے یہ وہم اور ضعف اعتقادی اس طرح اس کو اپنے لپیٹ میں لیتا ہے کہ یہ تصور اس کے ذہنوں میں ابھر تا رینگتا چلا جاتا ہے۔

اس کہانی میں تین عورتیں ہیں جو چھوٹے چھوٹے یادوں کے قصے بیان کرتی ہیں جو کہ دہلیز سے ہی متعلق ہوتے ہیں اس کی ماں کو عقیدہ ہے کوئی پیر فقیر اس دہلیز میں رہتے ہیں ان کا کبھی نام نہیں لینا چاہیے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے بس وہ ایک واہمہ ہے اس کو کبھی چھڑی، کبھی، چوٹی سے وہم ہوتا ہے مگر وہ ان دونوں کے علاوہ ہی ہوتا ہے یہ ان گھر کے لوگوں کے نصیب بھی بناتا ہے اور بگاڑتا بھی ہے وہ شجھ اور اشجھ کا کردار بھی ادا کرتا ہے یہ واہمہ سفید بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے یہ مرتا بھی نہیں ہے صدیوں سے زندہ ہے۔ اس کی داستان دادی اماں، پھر اماں اور پھر یہ لڑکی بیان کرتی ہیں۔ اس کو نہ موت آتی ہے نہ بیمار ہوتا ہے اسنے آب حیات پی رکھی ہے ماں جب اس قصے کو بیان کرتی ہے تو اس کو اس کے بچپن کا دوست بتو یاد آجاتا ہے جس کے ساتھ وہ دن رات صبح و شام اور چاندنی راتوں میں کھیلتی ہے اور ان کو بھی چور سپاہی کھیلتے کھیلتے کبھی کبھی اندھیری کوٹھری میں کالے سر کو دیکھ کر وہم ہونے لگتا تھا کہ کہیں وہ رہس سے چیز تو نہیں ہے جس کو امی بہت بیان کرتی ہیں۔ اور کبھی اس لڑکی کی لمبی چوٹی سے بتو کو وہم ہونے لگتا ہے یہ دراصل وہ پرانی یادیں ہیں جن کو یاد کر کے وہ اپنے ماضی کے دور اندھیرے جنگل میں چلی جاتی ہے جہاں سے نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ یادوں کی جانب بھانت بھانت کی دنیا میں کھوتی جاتی ہے جو اس نے بچپن کے دوران بتو اور اس دہلیز کے اندھیرے میں گزارے تھے چونکہ جب آدمی کو اپنے وطن اپنی زمین اپنی مٹی سے ایک جذباتی لگاؤ ہوتا ہے تو اس کو پھر اس کے ہر کونے کھدرے سے محبت ہونے لگتی ہے یہ وہ اس کی پرانی یادیں ہیں جب ان کو وہ Recall کرتی ہے تو پھر پرانی باتیں ایسے پھیلنے لگتی ہیں کہ اس کو پھر سمیٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان یادوں کی لکیروں کو وہ اتنا لمبا کھینچ دیتی ہے کہ وہ لکیر بڑھتی چلی جاتی ہے پھر زمین کا سرا اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

اس کے بعد اس کی ماں پھر ایک کہانی بیان کرتی ہیں کہ بہو چراغ میں تیل کم ڈالتی ہے رات اس کی بتی بھی گر جاتی ہے اور پھر اس اندھیرے میں وہ سرسراتا ہو واہمہ سنائی دینے لگتا ہے اور دربے سے مرغیوں کے شور کی آواز بھی آنے لگتی ہے پھر ان کا واہمہ اتنا بھیانک ہو جاتا ہے کہ ان کی دم گھٹنے لگتا ہے وہ بہو کو پکارتی ہیں پھر وہ نصین کو آواز دیتی ہیں مگر پورا گھر بے خبر سویا رہتا ہے پھر وہ پوری رات جگ کر آیت الکرسی پڑھتی ہیں، کہ وہ بے خبری میں رات میں کسی کو ڈس نہ لے اور صبح ہو جاتی ہے اماں جو طرح طرح کی کہانیاں سناتی ہیں ان وسوسے، شک، وحشت، وہم کو یاد کر کے وہ اپنے ماضی میں کھو جاتی ہیں۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

دہلیز دراصل یادوں کی وہ دہلیز ہے جو ماضی میں کٹ کے رہ گیا ہے اس افسانے کے چار کردار ہیں اماں جی، صفیہ، بتو، آپا جی، صفیہ اس کہانی کی مرکزی کردار ہے جو واحد متکلم کے بیان میں ان تینوں کے حوالے سے اپنے ماضی کو بیان کرتی ہے کبھی بتو کی زبان سے کبھی آپا جی کی زبان اور کبھی ماں کی زبان سے بیان کرتی ہے یہ دہلیز اس کی زندگی کی حسین یادیں ہیں اور وہ اس دہلیز کی اندھیری کوٹھری میں گم ہوتی چلی گئی ہے۔ انتظار حسین نے ایک عورت کی زبانی اور اس کی زاویہ نظر سے اپنی زمینی رشتوں صدیوں کی یادداشت اور اس کی معاشرے سے وابستگی کو دکھایا ہے۔ خاندانی بود و باش اور پرانی روایت و اقدار اور بچپن کی آزادی اور عورت کے دیگر مسائل کو ایک عورت کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے ایک متیلی کہانی ہے یاجوج ماجوج ایک متیلی کردار اس افسانے کو انہوں نے Pre Texuality اور بین المتونیت کے تحت لکھی گئی ہے اور اس میں انہوں نے قرآن واحادیث کے اسلامک اساطیر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یاجوج ماجوج رات بھر دیوار کو چاہتے ہیں اور تھک کر سو جاتے ہیں کہ باقی صبح کو چاٹ کو ختم کر دیں گے مگر ہر روز صبح کو دیوار اتنی ہی موٹی ہو جاتی ہے یہ منظر دیکھ کر وہ بہت پچھتاتے ہیں اور پھر وہ ارادہ کرتے ہیں کہ اب دیوار چاٹ کر ہی دم لیں گے اور وہ اپنی لمبی زبان سے دیوار کو چاٹنا شروع کر دیتے ہیں اور جب شام ہونے لگتی ہے تو دیوار انڈے کے چھلکے کی طرح ہلکی ہو جاتی ہے اور یہ دونوں تھک کر پھر سو جاتے ہیں یہ دم بھر کے لئے سونے جاتے ہیں اور اپنی اپنی کانہیں بچھا کر سو جاتے ہیں اور ان دونوں کے اٹھنے کے بعد دیوار پھر پہاڑ کے مثل ان کی سر پر کھڑی نظر آتی ہے۔ یہ دیکھ کر دونوں بہت مایوس ہوتے ہیں۔

> ”اے یاجوج کیا ہمارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ یاجوج ڈھئی آواز میں بولا کہ شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار چاٹا کریں اور روز صبح کو دیوار کوہ گراں کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جایا کرے۔“
>
> اس پر ماجوج مایوس ہو کر بولا: اگر یہی بات ہے تو دیوار کو ہم چاٹا کئے تو کیا، اور نہ چاٹا تو کیا۔ پس قبل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ لے، ہمیں چاہے کہ دیواروں کی طرف پشت کریں اور تھوڑا زندگی کو چکھیں۔(۱۱)

اس کے بعد قوم یاجوج ماجوج کا وہ بوڑھا جو پہاڑ کے کھوہ میں رہتا ہے اور ان کو تاکید کرتا ہے کہ ہر چیز کی ایک معنی ہیں ہر عمل کا ایک حاصل ہے دنیا میں ایسی کوئی دیوار نہیں ہے جو ہمیشہ قائم رہے گرنا اس کا مقدر ہے اور چاٹنا زبان کا مقدر ہے میں نے تمہارے باپ اور تمہارے باپ نے یافث سے اور یافث کے باپ نے اپنے باپ نوح سے یہ سنا ہے کہ ان کی اولاد سد سکندری کو چاٹ لے گئی اور پھر وہ آزاد ہو کر میدانوں اور سبزہ زاروں میں پھیل جائیں گے۔ وہ زبانیں جو پتھر چاہتی ہیں وہ شہر میں چشمے پیئں گے۔ پہلا گروہ قوم یاجوج ماجوج کا طبرستان کا میٹھے چشمے تک پہونچے گا اور وہ پانی پی کر ختم کر دے گا اور پچھلا گروہ یہ سمجھے گا کہ یہاں پانی کبھی تھا ہی نہیں۔

اپنی قوم کے بزرگ کی اس بات کو سن کر دونوں پھر دیوار چاٹنے میں لگ جاتے ہیں اس پوری کہانی کو انتظار حسین نے اسلامک اساطیری نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے جس میں سد سکندری اور یاجوج ماجوج کے عمل کو علامتی اساطیری معنویت کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ سکندر ذوالقرنین کے دور میں جبل قوقا، کوہ قاف کے ایک پہاڑی درے میں رہتی تھی بڑی سرکش قوم تھی ان کے ظلم و ستم اور شر و فساد سے وہ پورا علاقہ پریشان تھا جس کو ختم کرنے کے لئے بادشاہ ذوالقرنین نے لوہے اور تانبے کی ایک دیوار قائم کر کے ان کو مسدود کر دیا تھا تاکہ دوسری قومیں ان کے شر سے محفوظ رہیں اسی لئے دیوار کو سد سکندری بھی کہا جاتا ہے۔

آل یاجوج ماجوج اپنے بزرگ کی بات سن کر یکجا ہو جاتے ہیں کہ اے آل ماجوج تم سد سکندری ٹوٹ جانے پر پیچھے تو نہیں رہو گے تو آل ماجوج سوال کرتی ہے کہ تمہارے اس سوال کا کیا مطلب ہے تو وہ کہتا ہے آل یاجوج نے سرسبز پہاڑیوں پر قبضہ لیا ہے وہ پیٹ بھر کر کھاتے پیتے ہیں اور ہم پتھر چاٹ کر گزارا کرتے ہیں تو آل ماجوج بڑے جوش سے کہتی ہے کہ پے نہیں رہیں گے اور تشنہ لب رہیں گے ادھر آل ماجوج کو یہ خبر مل گئی ہے کہ سد سکندری گرنے والی ہے اور آل ماجوج پہلے نکل کر چشمہ پر قابض ہونا چاہتی ہے اور یہی صورت حال یاجوج کی قوم بھی کرتی ہے اور پھر دونوں قومیں آپس میں لڑ جاتی ہیں اور پوری رات لڑتی ہیں یہاں تک صبح ہو جاتی ہے اور یاجوج ماجوج سوئے پڑے رہتے ہیں سد سکندری موٹی اور اونچی ہو جاتی ہے دونوں اٹھ کر اس کو چاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب گرنے کی قریب ہو جاتی ہے تو شریں چشمہ کے سیر ابی کے لئے دو قومیں پھر رات میں نکل پڑتی ہیں اور جنگ کرتی ہیں اور پھر پوری رات لڑتے ہیں اور صبح ہونے پر یاجوج ماجوج سوئے ہوتے ہیں سد سکندری پھر موٹی ہو جاتی ہے دونوں یاجوج ماجوج اپنا راستہ پکڑ کر اپنے ٹھکانے کھوہ میں چلے جاتے ہیں اس کے بعد آل یاجوج

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

یہ ارادہ کر کے نکلتی ہے کہ آج روز روز کا قصہ ختم کر دیں گے یہ خبر آل ماجوج کو ملتی ہے اور پھر دونوں میں بہت معرکہ آرائی ہوتی ہے یہ قیامت جیسا منظر دیکھ کر ماجوج کی بیٹی یاجوج کے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

"اے میرے دادا کے بیٹے کے بیٹو! کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟" یاجوج کے بیٹے نے یہ سن کر تاؤ کھایا اور کہا کہ "اے ماجوج کی بیٹی! ہم تم میں سے کیونکہ ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جبکہ ہم یاجوج کی اولاد ہیں اور اپنے پہاڑوں میں رہتے ہیں اور تم ماجوج کی اولاد ہو اور اپنے پہاڑوں میں آباد ہو۔" ماجوج کی بیٹی یہ سن کر چلائی اور بولی کہی "اے میرے دادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تو اس سے انکار کرے گا کہ یاجوج ماجوج ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک ماں کی گود میں پلے؟"

یاجوج کا بیٹا قطعی انداز میں بولا: اے ماجوج کی بیٹی! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم یاجوج کے بیٹے ہیں قوم یاجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔

ماجوج کے بیٹوں نے یہ سن کر بہن کو پیچھے ڈھکیلا اور اونچی آواز میں کہا کہ "ہم ماجوج کے بیٹے قوم ماجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔"(۱۲)

اس کے بعد آل یاجوج اور آل ماجوج آپس میں لڑ جاتے ہیں اور پوری رات لڑتے ہیں صبح ماجوج کی بیٹیوں نے یاجوج سے شکایت کی تیرے بھائی کے بیٹوں نے ہمارے گھر بار اور سہاگ کو ویران کر دیا ہے پھر دونوں یاجوج ماجوج سد سکندری کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو ہی چاٹنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی قومیں آپس میں راتوں رات لڑتی ہیں قتل وغارت کرتے ہیں اور یاجوج ماجوج دونوں زبانیں لہراتے ہیں کہ قوم کا بزرگ اپنے کھوہ سے باہر آتا ہے اور یاجوج ماجوج کو دیکھ کر بڑے افسوس سے کہتا ہے۔

"اے یاجوج ماجوج! تمہارا برا ہو کہ تم سد سکندری کو تو نہی چاٹ سکے مگر ایک دوسرے کو سچ مچ چائے لے رہے ہو۔"(۱۳)

"یاجوج ماجوج اپنی داستان غم والم جب اس بزرگ کو سناتے ہیں اور انصاف چاہتے ہیں تو ان دونوں کی باتوں کو سن کر بڑے معنی خیز جملے کہتا ہے۔

میں ہابیل اور قابیل کے درمیان تو فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول تھا مگر یاجوج ماجوج کے باب میں کیسے فیصلہ کروں کہ میں یاجوج کی زبان کو ماجوج کے خون سے اور ماجوج کی زبان کو یاجوج کے خون سے لال دیکھتا ہوں۔"(۱۴)

اس تمثیل کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں مثلا وہ غربت و افلاس، جہالت وضلالت، مغربی تہذیب اور مغربی طاقتوں کا قوم مسلم کا استحصال اور اس کی بڑھتی ہوئی استعماریت مسلم تہذیب، مسلم بھائی چارگی، معاشرے کے لئے سد سکندری ہے جو یہ دونوں تو میں چاٹ کر ختم کر دینا چاہتی ہیں مگر کہیں نہ کہیں ناکام ہو جاتی ہیں اور انتظار حسین کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کا بیشتر افسانہ دور حاضر کا قصہ معلوم ہونے لگتا ہے جہاں آج دو قوم، تہذیب دو زبان، دور رایت کی وجہ سے لوگ ایک نہیں ہو رہے ہیں بلکہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ یاجوج ماجوج بہت ہی معنی خیز اسطورہ ہے جو دو بھائی۔ دو ملک، دو زبان بھی ہو سکتے ہیں مگر سد سکندری ان کے درمیان ایک ایسی دیوار ہے جو ان دو بھائیوں کو ملنے نہیں دیتی ہے مثلا پاکستان، بنگلہ دیش، فلسطین، عرب امارات اور دیگر اسلامی ممالک سب ایک باپ کے اولاد ہیں مگر ان کی روایت واقدار، تہذیب وتمدن، زبان وبیان، رہن سہن، بود باش الگ الگ نوعیت کے ہیں جس سے ان بھائیوں کی انفرادیت قائم ہے اور یہ زبان، یہ محلات، بادشاہت، حکومت تخت وتاج کی ہوس ان دو بھائیوں کو ملنے نہیں دیتے ہیں۔

آج فلسطین، شام، مصر، عراق، پاکستان سب ایک قوم ایک باپ سے ہیں مگر آپس میں لڑ رہے ہیں قتل وغارت کر رہے ہیں ان کے خون بھی یاجوج ماجوج کے خون کی طرح لال ہیں اور دیگر اسلامی ممالک کے بھی لال ہیں یاجوج ماجوج اپنے پہاڑ سے پہچانے چاہتے جاتے ہیں یعنی ان کے اپنے اپنے قومی نشانات ہیں اونچے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

اقدار، اونچی طرز زندگی اور طرز رہائش ہیں اس لئے ان کے لئے یہ سد سکندری جو ان کے امتیازات ہیں جو انہیں ایک ہونے نہیں دیتی ہے انتظار حسین کا اسلوب بہت تہہ دار اور علامتی نظام سے پر ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اس کہانی میں قدیم اسطوری داستانوں اور آسمانی صحائف اور قرآن و انجیل کے صحائفی زبان استعمال کیا ہے جس سے پورا افسانوی منظر اسلامی اور عربی روایت کو اپنے اندر سمولیتا ہے اور قاری کو اپنے گرفت میں لے لیتا ہے۔ سیڑھیاں" ایک اوہام باطلہ، انفرادی وجود اور اجتماعی وجود، تہذیب کے گم شدہ کھنڈرات اور بھوتوں جناتوں کے پر اسرار ماضی کے لمحات جواب گم شدہ ہیں جس کی بہترین مثال "سیڑھیاں ہے۔ اس کے چار کردار ہیں بشیر بھائی، سید رضی، اور اختر یہ تینوں اپنے اپنے خواب کو بیان کرتے ہیں اور پھر اس کی تعبیریں پیش کی جاتی ہیں۔ بشیر بھائی ایک قصہ سناتے ہیں کہ جب کچھ حادثات و واقعات ان کے ساتھ پیش آنے والے ہوتے ہیں تو ان کو پہلے ہی دکھائی دینے لگتا ہے مگر ہجرت کر کے جب سے وہ پاکستان گیا ہے تو اس کو خواب نہیں آتے ہیں وہ بہت پریشان رہنے لگتا ہے اور اس کو ایک خواب آتا ہے کہ وہ اپنے نانا کے ہاتھوں سے دونوں میں بھرا پیڑا لیتا ہے اور اس کے بعد وہ بیدار ہو جاتا ہے اور وہ نماز فجر ادا کرتا ہے اور اس کو نوکری مل جاتی ہے۔

رضی اور اختر بڑے انہماک سے یہ قصہ سنتے ہیں سید اپنے بستر پر کروٹ لے رہا ہے اور پھر اختر اپنا خواب بشیر سے بیان کرتا ہے کہ اس کو مردے خواب میں بہت دکھائی دیتے ہیں تو بشیر بتاتا ہے کہ مردے دیکھنا برکت کی علامت ہے اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے مگر مردے کو ساتھ کھانا کھاتے دیکھنا کال کی نشانی ہے اس درمیان سید ان کے ان باتوں سے بہت جھلا تا ہے اور اٹھ کر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تم سب تورات بھر خواب دیکھتے ہو اور اختر تورات بھر خواب دیکھتا ہے اور رات بھر خواب بیان کرتا ہے یہ سوتا کب ہے اور کہتا ہے کہ اسے تو کوئی خواب بھی دکھائی نہیں دیتا ہے تو بشیر کہتا ہے کہ خواب تو آدمی کی فطرت ہے۔

> "مگر میری فطرت کہاں رفو چکر ہو گئی۔ مجھے تو سرے سے خواب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اختر نے حیرانی سے پوچھا بالکل نہیں دکھائی دیتا جس روز سے یہاں آیا ہوں اس روز سے کم از کم بالکل نہیں اختر کہتا ہے حد ہو گئی ہے تمہارے ساتھ یہ حالات ہیں تو سید کہتا ہے میں حیران ہوں کہ اس ڈیڑھ بالشت کے چھت پر تم لوگ کیسے خواب دیکھ لیتے ہو جہاں چارپائی سے اترنے کی جگہ نہیں ہے۔ قدم اتارو تو لگتا ہے کہ گلی میں گر پڑیں گے اور یہ کہہ کر سید رک جاتا ہے۔"
>
> "ہمارے گھر کی چھت تھی کہ کہتے کہتے رکا اور پھر آہستہ سے بولا گئے کو کیا رونا اب تو شاید جلی ہوئی اینٹیں بھی باقی نہ ہوں۔"(۱۵)

سید کی اس گفتگو سے بات پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ چاروں کہیں سے ہجرت کر کے آئے ہیں اور جہاں رہ رہے ہیں ان کو رہنے کے لئے معقول مکانات نہیں ملے ہیں وہ کسی مکان کی تنگ چھت پر گزارا کر رہے ہیں جن کو نہ تو رہنے، نہ کھانے، نہ معاشرے سے ہمدردی مل رہی ہے اور وہ اپنے ماضی کو بار بار یاد کرتے ہیں جس کے وجہ سے وہ اپنے خوابوں میں اپنی روایتوں، مکانوں اور اسلاف کو دیکھتے ہیں کیونکہ نفسیاتی طور خواب ویسے ہی آتے ہیں جیسے انسان کے ذہن و شعور و لاشعور میں بسے رہتے ہیں اور وہ ان کو عدم دستیاب ہیں کیونکہ تقسیم کے بعد جو قوم پاکستان ہجرت کر کے گئی تھی تو ان کو وہاں معاشی مسائل جیسے تنگ دستی سے درکنار ہونا پڑا تھا۔ رضی جو اب تک کوئی قصہ نہیں بیان کرتا ہے وہ بیشتر کو آواز دے کر اپنا خواب سناتا ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے۔

> "ہمارا امام باڑہ ہے اور امام باڑہ ہے اور واں بڑا علم نکل رہا ہے "بشیر بھائی اس کی تعبیر بشارت بتاتے ہیں اور پھر بتاتا ہے کہ اس برس ہمارے یہاں علم نہیں نکلا تھا۔ وہ یعنی اختر اور بشیر سوال کرتے ہیں تو بتاتا ہے کہ "ہمارے خاندان کے سب لوگ تو یہاں چلے آئے تھے۔ بس میری والدہ واں رہ گئیں تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مرتے دم تک امام باڑہ نہیں چھوڑوں گی۔ ہر سال اکیلی محرم کا انتظام کرتی تھیں اور پھر بڑا اعلم اسی شان سے نکلتا تھا۔"
>
> پھر؟
>
> "بہت ضعیف ہو گئی تھیں وہ میں پہونچ بھی نہیں سکا۔ بس... اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔"(۱۶)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

انتظار حسین کے افسانوں اور ناولوں دونوں میں ان مذہبی عقیدوں (شیعہ) کے مناظر کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں چونکہ انتظار حسین خود شیعہ مذہب کے پیروکار تھے اور انہوں نے محرم، علم، اور دیگر شیعی مجالس بچپن سے دیکھی تھیں اس لئے ان کے افسانوں میں یہ مناظر اور کردار پائے جاتے ہیں۔

ہجرت کر کے جب لوگ پاکستان گئے تو خاندان کے بہت سے بزرگ اپنے اسلاف کے مقبروں کی حفاظت اور امام باڑوں کی دیکھ بھال کے لئے یہیں رک گئے ان کو اپنے اسلاف کی سر زمین، اپنی روایت واقدار اپنی پہچان اتنی پیاری تھی کہ اس کے تحفظ کے لئے انہوں نے ساری قربانیاں دینا قبول کر لی تھیں مگر تقسیم کے بعد ہندوستان کا پورا منظر بدل جاتا ہے کیونکہ اب یہاں سے زمینداری نظام، اسلاف کی قدریں، تہذیبی روایات، مسلمانوں کے ذریعہ معاش اور تمام چیزیں قصہ پارینہ بن جاتی ہیں اور ان رکے ہوئے افراد کے لئے ان کی ہی زندگی مصیبت بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کہانی میں سید کے بچپن کی یادداشت ابھرتی ہے مثلاً امام باڑے کے اندھیرے میں تانک جھانک جہاں وحشت خوف، اور اس کے اماں کی بیان کردہ کوڑیاں کالا سانپ، سید اور بندی کے بچپن کے نیم بیدار جنسی رومان، ان دونوں کا باغوں اور کنویں میں تانک جھانک کرنا، راجا باسک کے محل، سانپ کے جنت سے زمین پر آنے کے قصے اور دیگر سوالات، اور رضی کا اپنے پیدائش سے متعلق بیان کہ اس کی والدہ نے چھوٹے امام کی جالی پکڑ کے منت مانگی تھی تب وہ پیدا ہوا تھا اور اس کے بعد بشیر بھائی علم کے کرشمات و معجزات مثلاً علم کی شعاعیں ایسی کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد سید کا ناسٹالجیاں میں چلے جانا کہ وہ چمکتے علم، اہراتی پتنگ، روشن، اندھیرا خواب، سیڑھیاں، کنواں، وغیرہ جیسے خواب وہ بیان کرتا ہے اس کے بعد سید اپنی ماں سے وہ کہانی سنتا ہے جس میں کہانی کار شہزادی سے منع کرتا ہے کہ اس کہانی کو مت سنو وہ ضد کرتی ہے تو کہتا ہے بہت پچھتاؤ گی وہ شہزادی کو ایک دریا میں لے جاتا ہے خود دریا میں چلا جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے وہاں سے ایک کالا سانپ نکلتا ہے اس کے بعد رضی بتاتا ہے کہ اس نے علم چاندی کے، پھول سے مس کر کے بنوایا تھا مگر وہ غائب ہو گیا ہے۔

اور اب کوئی امام باڑے میں نہ چراغ جلاتا ہے اور نہ علم نکالتا ہے تقسیم کے واقعات ہیں جنکو ہر وانسان جو یہاں رک گیا تھا اس نے جھیلا تھا وہ اپنے خاندان سے تو محروم ہی ہوتا ہے یہاں وہ پوری طرح اپنے تہذیبی اقدار اور مذہبی مسائل سے بھی محروم ہو جاتا ہے کیونکہ نہ وہ اب مذہب کے شیدائی ہیں اور ان کے پاس نہ اتنے پیسے ہیں کہ وہ اپنے ضرورت زندگی کو بہ آسانی گزار سکیں وہ بہت غم انگیز مرحلے میں پھنس جاتے ہیں اور وہ روحانی طور پر اتنے ٹوٹ جاتے ہیں کہ ان کی روح کو کسی پل بھی راحت نہیں ملتی ہے۔

افسانے کے آخری حصے میں سید جب دیکھتا ہے کہ اختر، بشیر بھائی، رضی سب سو رہے ہیں تو وہ رضی کو آواز دیتا ہے کہ رضی سو گئے تو وہ کہتا ہے کہ نہیں ابھی جاگ رہا ہوں اور پھر سید رضی سے پوچھتا ہے کہ آخر اس کو خواب کیوں نہیں آرہے ہیں اور کہتا ہے، کہ بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک پتنگ کے پیچھے دوڑاتے زینے چڑھ رہا ہوں اور پھر سیڑھیاں تو رضی اس کو بہت ہی نارملی کہ یہ خواب نہیں یہ تو ادھر ادھر کے خیالات ہیں تو سید بہت فکر مند ہوتا ہے کہ کیا واقعی اس کو اب خواب نہیں آئیں گے پھر وہ اپنے یادوں میں کھوتا چلا جاتا ہے اور اس کو اپنے ماضی کے بہت سے چہرے یاد آتے ہیں اور اس کے ماضی میں مل جل جاتے ہیں اور پھر رضی سے کہتا ہے کہ مجھے اپنی شخصیت ہی ایک خواب لگتی ہے اور وہ ہمارے خواب جیسے ہو جاتے ہیں مثلاً نیم تاریک زینے، ایک بعد دوسرا تیسرا موڑ، اور سیڑھیاں پھسلتی چلی جاتی ہیں، اور یہ سید کو صبح کے وقت لگ بھگ نیند کے خمار اور غنودگی کا اثر خواب پیدا ہونے لگتا ہے اور اس کو لگتا ہے کہ اب کوئی خواب ضرور دیکھے گا اور وہ آنکھیں بند کر کے سو جاتا ہے۔ رضی کو نیند نہ آنا اگر ایک طرف حافظے کے زوال اور یادِ ماضی کے بکھرنے کا علامتی انداز بن کر ابھرتا ہے تو دوسری طرف سید کی آنکھوں نیندوں سے بوجھل ہونا اور اس کا امید کے ساتھ سو جانا کہ کوئی خواب دکھائی دے گا وہ حافظے کی بازیافت کا علامیہ بن جاتا ہے اس پر محمد سلیم الرحمن اور محمد عمر میمن کا کہنا ہے کہ یہ حافظے کے زوال اور شخصیت کی موت اور تخلیقی شخصیت کی موت کی علامت ہے جو اس طور پر رد ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد انتظار حسین نے پانچ افسانے لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کی زندہ تخلیقی احیاء کی علامتیں ہیں۔ یہ ایک تمثیلی کہانی ہے جس کا ماحول "کٹا ہوا یاد دہلیز کے ہی طرح ہیں جس میں بچپن کی روشن، تاریک، یادیں، لمبی لمبی راتیں، بندر، گلیاں، سڑکیں، چھت منڈیر، کنواں کے منڈپ، تاریک سیڑھیاں اور زینے اندھیرے امام باڑے اور اندھیرے روشن دان میں تانک جھانک وہی یادوں کے دھندلے دھندلے۔ اور طرح طرح کے خواب یہ کہانی شیعہ مذہب کے معتقدات، اساطیری تمثیلی اثرات نسلی اور اجتماعی سفر اور خواب کی داخلی کہانیاں جو پورے ماضی کی یادداشت کو اپنے اندر محفوظ رکئے ہوئے ہیں۔

مردہ راکھ انتظار حسین کا یہ افسانہ شیعہ عقائد سے متاثر کہانی ہے اس میں ان کے اجتماعی لاشعور کا بہت عمل دخل ہے اس افسانے میں شیعہ مذہب کے عقیدے کے اعتبار سے بہت سی تاریخی و نیم تاریخی تلمیحات و استعارات کا استعمال کیا ہے مثلاً علم، دلدل، غیاب، امام کی سواری جیسے روایتوں سے افسانے کا تانا بانا تیار کیا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

گیا ہے اس افسانے کے چار کردار ہیں فرزند علی، محمد عوض کربلائی تفضل، اختر، تراب علی متولی، افضال حسین، جو اپنے نام اور وجود کے اعتبار سے ایک تاریخی تلمیحی حیثیت کے حامل ہیں۔

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ اس برس سواری نہیں آئی اور یہ واقعہ بڑا علم گم ہونے کے ایک سال بعد کا ہے۔ جس کو فلیش بیک میں بیان کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں اجتماعی لاشعور کے تحت یہ باتیں بسی ہوئی ہیں کیونکہ انہوں نے بچپن سے لیکر آخری دنوں تک ان مذہبی مسائل کو دیکھا سنا تھا اگرچہ وہ خود کو شیعہ نہیں کہتے تھے۔ عزاخانوں میں، جھاڑ فانوس، لوبان، موم بتیاں، اگر بتیاں اور ماتم کنان اور نوحہ خواں سب کے سب محرم کا چاند دیکھتے ہی نکل پڑتے تھے۔ مگر تفضل حسین کے ہاتھوں بڑا علم ہونے کے بعد سے جب وہ علم صرف چھڑی رہ جاتا ہے تو دگوں کے اندر سے وہ تمام شوق اور جذبے ختم ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "شہر افسوس" میں ہجرت کا عنصر سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی ہجرت اُسے ناسٹلجیائی کیفیات کی طرف لے کے جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، وہ جو کھوئے گئے، مشمولہ، ''شہر افسوس''، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۲ص، ۴۷۹

۲۔ ایضاً، ص ۴۸۱

۳۔ ایضاً، ص ۴۸۳

۴۔ ایضاً، ص ۴۸۳۔ ۴۸۲

۵۔ ایضاً، ص ۴۰۳

۶۔ ایضاً، ص ۴۸۳

۷۔ انتظار حسین، کٹا ہوا ڈبا، مشمولہ ''شہر افسوس''، ص ۴۹۲

۸۔ ایضاً، ص ۴۹۲

۹۔ ایضاً، ص ۴۹۶

۱۰۔ انتظار حسین، کہانی کی کہانی، مشمولہ، ''شہر افسوس''، ص، ۶۲۵

۱۱۔ انتظار حسین، وہ جو دیوار کو چاٹ نہ سکے، مشمولہ، ''شہر افسوس''، ص ۵۹۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۹۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۹۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۰۹

۱۶۔ انتظار حسین، سیڑھیاں، مشمولہ، ''شہر افسوس''، ص، ۵۱۰-۵۱۱